نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 35869501-3
www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(جو تیسرے ایڈیشن کے لیے تحریر کیا گیا تھا)

یہ ایک تقریر ہے جو راقم الحروف نے اوائل ۱۹۷۳ء میں ناظم آباد کراچی کے بلاک نمبر ۵ کی جامع مسجد میں ماہِ ربیع الاول کی مناسبت سے کی تھی۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی ہمت کہ انہوں نے اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور معمولی حک و اضافے کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں کراچی ہی سے شائع کر دیا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اسے از سرِ نو مرتب کر کے ’’مسلمانوں پر نبی اکرم ﷺ کے حقوق‘‘ کے عنوان سے شائع کروں‘ لیکن بوجوہ اس کی نوبت نہ آئی اور احباب کے تقاضے پر اسے دوبارہ اسی صورت میں ۱۹۷۷ء میں مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی لاہور سے شائع کر دیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ تیسری بار اشاعت کی نوبت آئی تو نئی ترتیب دے لوں گا‘ لیکن افسوس کہ اس بار بھی اسے جوں کا توں ہی شائع کرنا پڑ رہا ہے۔ ویسے اس تقریری انداز کا ایک فائدہ بھی ہے کہ یہ نسبتاً زیادہ عام فہم ہے‘ اس لیے اس کا حلقۂ افادہ وسیع رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلقات کی اساسات اور ان کے مضمرات کا صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور ان پر عملاً کاربند ہونے کی توفیق بھی مرحمت فرمائے۔ آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
لاہور‘ یکم ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

عرضِ ناشر (برائے بار سیزدہم)

’’نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں‘‘ کا تیرہواں ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اس بار اشاعت سے قبل اس کتابچے پر بھرپور طور پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ چنانچہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی‘ عبارت کو زیادہ واضح اور آسان فہم بنانے کے لیے مناسب اصلاح کر دی گئی ہے۔ مزید برآں قارئین کی سہولت کے لیے اس کتابچے میں شامل آیات و احادیث کے باقاعدہ حوالے بھی درج کر دیے گئے ہیں‘ اور اس کے ساتھ ساتھ نئی کمپیوٹر کتابت کے ذریعے اس کتابچے کے حسنِ ظاہری کو بہتر بنانے کا بھی کسی قدر سامان کر دیا گیا ہے۔ گویا اس کتابچے کو از سرِ نو مرتب کرنے کا جو کام محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے پیشِ نظر تھا وہ اللہ کے فضل و کرم سے کسی نہ کسی درجے میں اب پورا ہو گیا ہے۔ فَلِلّٰہِ الحَمدُ و المنّۃ۔

ناظم نشر و اشاعت
مرکزی انجمن خدام القرآن‘ لاہور
۲۰/اپریل ۱۹۹۴ء

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

① ایمان	6
② توقیر و تعظیم	8
اطاعت	10
محبت	12
اتباع	14
انتباہ	16
③ نصرتِ رسولؐ	19
تبلیغ کا بارِ گراں	20
دعوت و تبلیغ کی غایت اولیٰ	21
آنحضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری	23
امتحان اور آزمائش	25
دروں بینی کی ضرورت	26
نبی اکرم ﷺ کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں	28
اتباع کا تقاضا	30
رسولؐ کی نصرت اللہ کی نصرت ہے	31
④ اتباعِ قرآن مجید	32
حبل اللہ	34
ہماری حالت زار	35
اصلاحِ حال کا واحد طریق	37
حرفِ آخر	42

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ...... اَمَّا بَعْدُ:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِی الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ :

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾﴾ (الاعراف) صدق اللّٰہ العظیم

ربیع الاوّل کے مہینے میں چونکہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی‘ لہٰذا اس مہینے میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً آنحضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں‘ آپ ﷺ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت و عقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ ہم نے بحیثیت اُمتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور نبی اکرم ﷺ کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیے۔ یہ جھوٹا اطمینان (pseudo satisfaction) عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ازروئے قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے اور ہم سے خدا کے ہاں آنحضور ﷺ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہوگا؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضور ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کریں اور اس ضمن میں جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کا ازالہ کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اگر ہم یہ ارادہ لے کر سیرت کی کسی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر وہاں سے اٹھیں تو یہ یقیناً فائدے کی بات ہے اور آخرت کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کے تقاضوں کو واضح کرنے کے لیے میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے لیے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا آخری جزو منتخب کیا ہے:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾

”پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے انؐ کی توقیر و تعظیم کی، اور جنہوں نے انؐ کی مدد اور حمایت کی (یعنی انؐ کے مشن میں انؐ کے دست و بازو بنے، اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو انؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں۔“

جس آیتِ کریمہ کا آخری جزو اِس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ پوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ اس میں اصل تخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ ”اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ“ ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں اور جن کی آمد کی خوش خبری انبیاءِ سابقین دیتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس آ گئے ہیں، یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں، اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بیجا وزن اور بوجھ لاد رکھے ہیں اور رسوم و قیود کی جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں، ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں...... اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾

آیت کریمہ کے اس حصے پر غور کرنے سے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق کی چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

- پہلی یہ کہ حضور ﷺ پر ایمان لایا جائے، آپؐ کی تصدیق کی جائے۔
- دوسری یہ کہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔
- تیسری یہ کہ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔
- چوتھی یہ کہ حضور ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لیے اس مینارۂ نور سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں پیش کر دی جائیں، جو اگرچہ تفصیل کی متقاضی ہیں، لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کر دی جائیں جو ہمارے لیے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

① ایمان

متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ کو اللہ کا نبی، اللہ کا رسول، اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اقرار و یقین کا نام ”ایمان“ ہے اور اسی سے ہمارے اور حضور ﷺ کے مابین ایک تعلق اور رشتے کا آغاز ہوتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں اگرچہ سادات اور ہاشمی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، لیکن عظیم اکثریت یقیناً اُن لوگوں کی ہے جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہر اُمتی کو حضورؐ کے ساتھ ایک نسبت و تعلق حاصل ہے اور یہی تعلق سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے، یعنی ایمان کا تعلق، اِس یقین کا تعلق کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو پورے عالم کے لیے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کیے گئے

اور جو تمام بنی نوعِ آدم کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ...... ﴾ (سبا: ۲۸)

''اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر!)''

اکثر و بیشتر حضرات کے علم میں ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ میں ان دو درجوں کے لیے دو اصطلاحیں آئی ہیں' ایک اِقْرَارٌ بِاللِّسَان اور دوسری تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْب۔ یعنی نبی اکرم ﷺ پر ایمان کے ضمن میں زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقینِ کامل رکھنا۔ ان کو آپ ایمان کے دو درجے' دو مراتب' یا دو پہلو کہہ سکتے ہیں اور جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے لیکن دل میں یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں' بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے' بلکہ آپؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے' لیکن ان کے دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنم قرار پایا' بلکہ جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء: ۱۴۵) ''یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔'' اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضور ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو' لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانونِ شریعت کی رُو سے ایسا شخص کافر قرار پائے گا۔ دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ' اور آخرت میں وہی شخص مؤمن قرار پائے گا جو اقرارٌ باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو' جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمد ﷺ بن عبداللہ بن

عبدالمطلب اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابد الآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرارٌ باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

② توقیر و تعظیم

ایمان کے دونوں درجوں کو لازم و ملزوم سمجھنے سے یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ میں آ جائے گی کہ ایمان جب یقینِ قلبی کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات لازماً پیدا ہونے چاہئیں۔ اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد ''عَزَّرُوْهُ'' کے لفظ میں آیا ہے۔ ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ﴾ یعنی ''پس وہ لوگ جو محمد (ﷺ) پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی''۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہوگیا کہ آپؐ ہمارے خالق' ہمارے مالک' ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں' اس کے پیغامبر ہیں' اس کے رسول ہیں' جنہیں اس نے ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے اور آنحضور ﷺ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے' جو تعلیم دی ہے' جو احکام دیے ہیں' جو خبریں دی ہیں' جو اوامر و نواہی بتائے ہیں' حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں' ان میں سے کوئی بات بھی انہوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے' جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ ''اور یہ (رسول ﷺ) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو صرف وحی ہے جو (ان پر) بھیجی جاتی ہے''۔ تو دل میں آپؐ کی توقیر و تعظیم کا جذبہ پیدا ہونا اور عمل میں اس کا اظہار منطقی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ

آنحضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا ادب و احترام ہے۔

سورۃ الحجرات میں اس ادب و احترام اور توقیر و تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں سے مطلوب ہے اور جو انہیں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴿۲﴾﴾

’’اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو‘ مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں شعور تک نہ ہو۔‘‘

شعور و احساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ آنحضور ﷺ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں رسول ﷺ کی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا‘ بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے نیک اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی اور آپ ﷺ کی رائے کو پسِ پشت ڈال دینا تو بڑی دُور کی بات ہے‘ جس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں‘ محض یہ سوئے ادب کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر دیا جائے‘ تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے اور کیسی زبردست تنبیہہ کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کے معاملے میں ایسی بے احتیاطی برتنے کے سبب سے اب تک کے تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا‘ تمہاری سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں معلوم تک نہ ہو گا کہ تم نے اس بے ادبی اور بے احتیاطی سے کیا کچھ کھو دیا اور تم کیسے عظیم نقصان اور خسارے سے دوچار ہو گئے۔ اس لیے کہ تم اس مغالطے میں رہو گے کہ ہم نے حضور ﷺ کی کوئی حکم عدولی تو نہیں کی اور ہم سے کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا۔ سورۃ الحجرات کی اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان بالرسالت کا پہلا لازمی نتیجہ نبی

اکرم ﷺ کا ادب و احترام اور آپؐ کی توقیر و تعظیم ہے۔

اب اسی ایمان کے دو مضمرات رسول اللہ ﷺ کی دو مشہور احادیث کے حوالے سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسول ﷺ اور دوسرا ہے محبتِ رسول ﷺ۔

اطاعت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا پہلا لازمی نتیجہ آپؐ کی مکمل اطاعت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى یَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ)) (۱)

’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔‘‘

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں ’’شرح السُنہ‘‘ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک ان تمام احکامِ شریعت‘ حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دلی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن و سنت کے ذریعے سے پیش فرمائے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی خواہشات کو کچلتے ہوئے قرآن و سنت پر عمل کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن و سنت کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہو گا۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ﴾ اسی طرح سورۃ التغابن (آیت ۱۲) میں فرمایا گیا: ﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ

(۱) رواہ فی شرح السُّنّۃ‘ وقال النووی فی اربعینہ : ھذا حدیث حسن صحیح‘ رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح۔

﴿وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ یعنی ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔''
جب محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ مان لیا ہے تو اب تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تمہیں انؐ کا ہر حکم ماننا پڑے گا اور ہر ارشاد کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ جس رسول کو بھی بھیجتا ہے اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ۶۴) میں فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (آیت ۸۰) ''جس شخص نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لیے ہمارے پاس خود نہیں آتا' اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لیے انبیاء و رسل کو واسطہ بنایا ہے' لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسولؐ کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا کہ:

((مَنۡ اَطَاعَنِیۡ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَقَدۡ عَصَی اللّٰہَ)) (۱)

''جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے لزوم کے لیے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾﴾

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجہاد' باب قول اللّٰہ تعالیٰ: اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم...... وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ...... عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

''پس نہیں' آپ کے ربّ کی قسم! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں' پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں۔''

یہ آیتِ مبارکہ حضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے نصِ قطعی ہے۔ رسول محض مان لینے کے لیے نہیں بھیجا جاتا' بلکہ وہ اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے' اس کے تمام فیصلے تسلیم کیے جائیں' اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے' اس کی سنت کی پیروی کی جائے اور اس کے نقش قدم کو راہنما بنایا جائے۔ حضور ﷺ کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں' بلکہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے لازمی عملی نتیجے کے طور پر آپؐ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس اطاعتِ کُلی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا' لیکن یہ حقیقی ایمان کے اعتبار سے خدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔

محبت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا دوسرا لازمی نتیجہ آپؐ سے محبت ہے۔ صرف زبردستی' مجبوری اور مارے باندھے کی اطاعت تو کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جا سکتی ہے' بلکہ کی جاتی ہے' لیکن جب یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ کے لیے مطلوب ہو تو پھر زبردستی کی اطاعت نہیں' بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو انتہائی گہری محبت' دل کی پوری آمادگی اور پورے انبساطِ قلب اور شرح صدر کے ساتھ ہو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی اَکُوۡنَ اَحَبَّ اِلَیۡہِ مِنۡ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حبّ الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب محبۃ رسول اللّٰہ ﷺ اکثر من الاهل والولد والوالد والناس اجمعین...... عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ-

‘‘تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لیے اس کے باپ‘ اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔‘‘

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مؤمن نہیں۔ حدیثِ مبارک کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے‘ بلکہ بڑے واضح الفاظ میں صاف صاف اور دوٹوک انداز میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت آپؐ پر صحیح معنوں میں وہ ایمان ہی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا: ‘‘عمرؓ! تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟‘‘ ذرا اندازہ لگایئے کہ اس گفتگو سے کس قدر اپنائیت کا احساس اُبھرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا۔ سوال کا انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اس ہستی سے کیا جا سکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلّم ہو۔ حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا کہ ‘‘حضور! آپؐ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔‘‘ حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ‘‘اور خود اپنی جان سے بھی؟‘‘ اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: ‘‘اَلْآنَ‘‘ یعنی ہاں حضور! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سوال کا جواب سوچ سمجھ کر‘ اپنا جائزہ لے کر اور اپنے دل کے اندر جھانک کر دیا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعوائے محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں‘ اِلّا ماشاء اللہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ‘‘ہاں‘ اب تم مقامِ مطلوب تک

پہنچے ہو‘‘۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز‘ ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اِتباع

دل کی حقیقی محبت‘ طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم ہی کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو‘ بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہے اور اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند‘ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے‘ ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے‘ چلتے کس طرح ہیں‘ وہ لباس کون سا پہنتے ہیں‘ انہیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں خواہ کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو‘ لیکن جس کے دل میں کسی کی حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے‘ جو کسی کا والہ و شیفتہ ہو جائے‘ اس کے لیے وہ احکام جو الفاظ میں دیے گئے ہوں‘ زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں یا وہ کام جن کے کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو اُن کا تو کہنا ہی کیا‘ وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل‘ ایسے شخص کے لیے تو چشم و ابرو کا اشارہ بھی حکمِ قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ محبوب کی ہر ہر ادا کی نقالی اور اس کے ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا: ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام ‘‘اتباع‘‘ ہے جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں جن سے ان کے جذبۂ اتباع کا پتا چلتا ہے۔ وہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے‘ اتفاق سے حضور ﷺ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا‘ لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا کہ جب کبھی ان کا اس

راستے سے گزر ہوتا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر میں آنحضور ﷺ نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا‘ جہاں جہاں استراحت فرمائی اور جہاں حوائج ضروریہ سے فراغت پائی‘ حضرت ابن عمرؓ نے سفرِ حج میں انہی مقامات پر پڑاؤ‘ استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا۔ حالانکہ انہیں حضور ﷺ کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور شریعت کے لحاظ سے آپ ﷺ کے یہ اعمال واجب التعمیل بھی نہیں تھے‘ بلکہ خالص عقلیت پسند (rationalist) لوگ تو شاید اس کو جنون اور خواہ مخواہ کا fanaticism کہیں‘ لیکن یہ معاملہ عشق و محبت کا معاملہ ہے جس میں محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنا فی حبِّ الرّسول ﷺ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویہ یہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح سِیَرِ صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے جو کسی دُور دراز علاقے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مشرف با سلام ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو بس اسی ایک موقع پر دیکھا تھا اور اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ کا گریبان کھلا تھا۔ آپ ﷺ کو کھلے گریبان کے ساتھ دیکھ کر ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے‘ اس لیے کہ انہوں نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کی طرف سے انہیں ایسا کوئی حکم تو کجا‘ کسی ادنیٰ درجے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا‘ اور شریعت کی رو سے یہ نہ فرض ہے نہ واجب‘ لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کے ہر نقش قدم کی پیروی اور ہر ادا کی نقالی اپنے اوپر لازم کر لی جائے۔ اسی طرزِ عمل کا نام قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اتباع ہے۔

اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۱ کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ
وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۱﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو‘ (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا‘ اور اللہ بہت معاف کرنے والا (اور) بہت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم ﷺ کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں ان کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اب تک کی گفتگو کے اہم نکات کا اعادہ کر لیں اور اس کے لُبِّ لباب کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور اہم ترین بنیاد آپ ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اس ایمان کا زبانی اقرار بھی ضروری ہے اور قلبی یقین بھی۔ پھر ایمان کا اوّلین تقاضا آنحضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپ ﷺ کا کماحقہ‘ ادب و احترام ہے۔ آپؐ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کے دو ناگزیر لوازم ہیں۔ ایک اطاعتِ کلی اور دوسرے محبتِ قلبی جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور جب یہ دونوں جمع ہوں گی تو اس کا نام ’’اتباع‘‘ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کر لو‘ اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت کرے گا‘ تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔

انتباہ

یہاں پر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے ان دونوں ناگزیر لوازم میں سے اگر ایک بھی غائب ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے

آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر نبی اکرم ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے' لیکن محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے' یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کی کیفیت نہیں ہے' دل میں تنگی اور اپراہٹ ہے' تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دَور کے منافقین بھی ایمان لانے کے مدعی تھے اور وہ آپؐ کی اطاعت بھی کرتے تھے' لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعتِ رسول ﷺ تو درکنار رسول اللہ ﷺ کے احکام کا استہزاء کریں' جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں' ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں' سنت رسول ﷺ کے التزام سے انکار کریں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو آج کے دَور کے لیے ناقابلِ عمل قرار دیں' لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اُس معاشرے کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا اور خود کو مسلمان کہلانا تھا اس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ اس پر مجبور تھا کہ نماز پڑھے' شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائضِ دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے جتن کرتے تھے' بلکہ قسمیں کھا کھا کر حضور ﷺ کو اپنے صادق و مخلص ہونے کا یقین دلاتے تھے' لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی' وہ تھی یقینِ قلبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حضور ﷺ سے حقیقی و واقعی محبت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون میں فیصلہ فرما دیا کہ:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾

''(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشبہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں۔''

یعنی ان کی یہ بات تو اپنی جگہ سچی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں' لیکن چونکہ یہ دل سے آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں' ان کے دلوں میں آپؐ کی حقیقی محبت موجود نہیں' صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں' ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور' اس لیے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قلبی یقین اور محبت کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہو تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ محبتِ رسول ﷺ کے محض دعوے ہیں' لیکن اطاعت نہیں' فرائض کی ادائیگی نہیں' اوامر و نواہی کی پرواہ نہیں' احکامِ شریعت کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں' تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت اور فسق و فجور پر مبنی ہے۔ محبت کا یہ خالی خولی دعویٰ اللہ کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ ایسا دعویٰ تو اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوسکتا' بلکہ مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ کسی بیٹے کو والد کی محبت کا دعویٰ ہو' لیکن وہ ان کا کہنا نہ مانتا ہو' بلکہ ہر عمل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیتا ہو تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعوائے محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے بلند بانگ دعاوی' بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام' بڑے جوش و خروش اور شان و شوکت سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالسِ سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی اور پیرویٔ سنت کے جذبہ سے عاری ہیں تو یہ سب کچھ سراپا ڈھونگ ہے' فریبِ نفس ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں' میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں' اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں' بلکہ یہ سب قابلِ مؤاخذہ ہیں۔

③ نصرتِ رسول ﷺ

آیت زیرِ مطالعہ میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد ''وَنَصَرُوْهُ'' کے لفظ میں بیان ہوئی ہے' یعنی ''جن لوگوں نے آپ (ﷺ) کی مدد اور حمایت کی۔'' اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بات طے کرنی چاہیے کہ رسول ﷺ کی نصرت وحمایت اور ان کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ نبوت و رسالت ایک فریضۂ منصبی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رُسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا' نیند کے ماتوں کو جگانا' انسان کو شرک کے اندھیاروں میں سے نکال کر توحید کے روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا' اسے اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کا خوگر بنانا' انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا' معاشرے میں سے ہر قسم کے جور واستبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا' اور انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک وآقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لیے کھڑا ہونا ہوگا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦﴾ (المطفّفین) اور ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝١٩﴾ (الانفطار) یعنی جس روز لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا' کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا اور جس دن تکوینی حاکمیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ تشریعی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی وجہد کا نتیجہ اس کے سامنے ہوگا۔ برے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا' اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیشِ نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝٣٥ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝٣٦ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝٣٧ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝٣٨ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝٣٩ وَاَمَّا

مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝٤٠ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝٤١﴾ (النّٰزعٰت)

''جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ تو جس نے سرکشی کی تھی' اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی!''

تبلیغ کا بارِ گراں

دعوت وتبلیغ کا کٹھن کام' شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری' بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام' طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور اقامتِ دین کے جان جوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا' یہ تھا وہ بارِ گراں جو نبوت ورسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا۔ اس بارِ گراں کی خبر حضور ﷺ کو نبوت کے آغاز ہی میں دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں فرما دیا گیا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝٥﴾ یعنی ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے (ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے)'' اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند ہی دنوں بعد آنحضور ﷺ کے شانوں پر رکھ دیا گیا' چنانچہ سورۃ المدثر میں حکم آ گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣﴾ یعنی ''اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو' ان کو ہوشیار کرو' ان کو باطل عقائد اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ) اور اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کرو۔''

سورۃ المدثر کی تیسری آیت میں نبی اکرم ﷺ کو ''تکبیرِ ربّ'' کا حکم دیا گیا ہے' جس کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور اللہ کی بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں' بلکہ فی الواقع وہ

نظام قائم اور برپا کر دینا ہے جس میں تشریعی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ اعلیٰ اور مقتدرِ مطلق (Absolute Sovereign) تسلیم کیا جائے' اسی کا حکم حرفِ آخر ہو' اسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو' اسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلندتر ہو جائے اور اسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے۔ بجوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ (التوبة: ٤٠) ''اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے۔'' کبریائی تو واقعتاً وہ کبریائی ہے جو عملاً قائم ہو' محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں اور محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی' بلکہ بڑائی اور کبریائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ ''تکبیرِ ربّ'' کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے احکام' اس کی ہدایات اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو' اس کا عطا کردہ آئین اور اس کے نازل کردہ قوانین عملاً نافذ ہوں' اور اس طرح اسے حقیقی طور پر مقتدر تسلیم کیا گیا ہو۔

دعوت و تبلیغ کی غایتِ اولیٰ

مدنی دَور میں اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں' لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی نہ صرف آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے' بلکہ آپ ﷺ کی بعثت کی غایتِ اولیٰ ہے۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول یا نبی آنے والا نہیں' لہٰذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری کتاب اور مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا وہاں یہ بھی ضروری قرار دیا کہ دینِ حق بتمام و کمال قائم بھی ہو' تاکہ انسان کے لیے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ یہ مضمون مدنی دَور کی تین سورتوں' سورۃ التوبہ (آیت ۳۳) سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصّف

(آیت ۹) میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) دے کر تاکہ وہ اِس (ہدایت اور دین حق) کو پورے کے پورے دین (نظامِ حیات) پر غالب کر دے۔''

تو یہ تھا وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم ﷺ کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور ظہورِ نبوت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ آپؐ اس وقت پورے عالمِ انسانی میں اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل یکہ و تنہا تھے۔ دنیا کے بت کدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا' تکبیرِ ربّ کا نعرہ لگانا' خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا' اظہار و غلبۂ دین کے لیے کشمکش کرنا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا' اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا علَم بلند کرنا اور ظلم و تعدّی' جور و ستم اور استبداد و استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا' اسی لیے اسے ''قولِ ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیرِ ربّ کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرے سے اعلانِ جنگ تھا اور حضور ﷺ کو حکم تھا کہ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثر) یعنی ''کھڑے ہو جاؤ' پس (بنی نوعِ انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو!'' آپؐ سے فرمایا گیا کہ آپ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی فرماتے رہیں اور ''وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ'' اور ''وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝'' کے مصداق چاہے مشرکوں اور کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہو وہ کتنا ہی راستہ روکیں اور مزاحمت کریں' وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرے میں پڑ گئی ہوں' وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں' کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں' ظلم و تشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں اور جور و تعدّی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں' ان تمام مخالفتوں' مظالم اور استبداد کے علی الرغم' ان تمام موانع کے باوجود اور ان تمام شدائد و مصائب کے باوصف نبی اکرم'

سرورِ عالم، محبوبِ خدا، رحمۃٌ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ ربّ کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں، باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوں اور اس راستے میں ہر نوع کے شدائد و مصائب اور ہر طرح کے طنز و استہزاء اور طعن و تشنیع کے وار برداشت کریں۔ یہ وہ بھاری بوجھ اور بھاری ذمہ داری تھی جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔

آنحضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری

نبی اکرم ﷺ کے فرضِ منصبی کے ادراک سے نصرتِ رسول ﷺ کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو شخص آنحضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس کا دل اس بات کی تصدیق کرے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اس کے لیے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی میں آپ ﷺ کا رفیق و ناصر بنے۔ اب اسے تکبیرِ ربّ کی کٹھن مہم میں، اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی جاں گسل جدوجہد میں، دعوت و تبلیغ کے راہِ خارزار میں، حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ جنگ و جدال میں رسول اللہ ﷺ کا دست و بازو اور آپؐ کا حامی و مددگار بننا ہوگا۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعثِ فخر و سعادت سمجھے، اسے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کا یقین ہو، اس کا جینا اور مرنا حضور ﷺ کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہو، اس کا مال و منال اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لیے وقف ہوں جو خالقِ کائنات اور ربّ العالمین کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) نہ ہو تو ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا دعویٰ غیر معتبر ہے، اور مغالطے اور فریبِ نفس پر مبنی ہے۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ﷺ ہے۔

لفظ نصرت سے کسی کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ اللہ کے نبی اور رسول علیہ الصّلاۃ والسلام کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت؟ نبیؐ کا مقام و مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود اُن کا مولا اور ناصر ہوتا ہے، پھر اللہ کے فرشتے نبیؐ کے پشت پناہ ہوتے ہیں، اور نبیؐ کو تو روح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے، لہٰذا نبیؐ کو اہلِ ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت؟ پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس عالمِ اسباب میں دینِ حق کے غلبے کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو زمین میں اللہ کے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انبیاء و رُسل کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق و انفس میں اللہ کی آیات انبیاء و رُسل کی دعوت کے قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان کی صداقت کے ثبوت کے لیے ان پر آسمانی کتابوں کا نزول بھی ہوتا ہے جو واضح اور روشن آیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات سے بھی سرفراز فرماتا ہے، لیکن حق کو قبول یا ردّ کرنے کے فیصلہ کے لیے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ﴿۳﴾﴾ (الدھر) یعنی ”ہم نے تو انسان کو سیدھی راہ سجھا دی ہے، اب وہ حق کو تسلیم کرے یا ناشکری کرے!“ بہرحال اقامتِ دین، شہادتِ حق اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعیٔ اوّل ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾﴾

”اے نبی (ﷺ!) ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔“

امتحان اور آزمائش

پھر جو لوگ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی دعوت قبول کریں اور اس پر ایمان لائیں' اللہ تعالیٰ عزوجل اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچتا ہے' ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ اس عالمِ علت ومعلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر' رسولؐ پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مؤمنینِ صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں' ان کے ایثار وقربانی اور ان کی جدوجہد سے پھیلے گا۔ دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہوگی تو ان ہی کی کشاکش' محنت اور جہاد وقتال سے قائم ہوگی۔ وہ خاک و خون میں لوٹیں گے اور راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید ونصرت سے اللہ کا دین غالب ہوگا۔ یہی سنت اللہ ہے' اور اللہ کو ایسے ہی جوانمردوں سے محبت ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

''یقیناً اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اور انہی سرفروشوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے: ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی جدوجہد اور کشمکش میں مؤمنینِ صادقین کی آزمائش ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان کا جھوٹا دعوے دار ہے۔ اس جہاد وقتال کے ذریعے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں سردھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول ﷺ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ﷺ ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عالمِ رنگ و بو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں' جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱﴾ ''اور اللہ تعالیٰ لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو منافق ہیں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مؤمن بنے پھرتے ہیں' جو حقیقتِ واقعی کے لحاظ سے منافق ہیں۔ اس دنیا میں ایمان ونفاق کا فیصلہ انہی آزمائشوں' ان ہی سرفروشیوں اور ان ہی جانفشانیوں سے ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا؟ آپ ﷺ کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا؟ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے منصبِ رسالت کی تکمیل میں اپنا جان و مال کھپایا یا نہیں کھپایا؟ دعوت الی اللہ کے مراحل میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی؟ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں' پھر تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ ناقابلِ قبول ٹھہرے گا' رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد کر دیا جائے گا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا اور دکھاوا قرار پائے گا۔

دروں بینی کی ضرورت

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ذرا چشمِ تصور میں غزوۂ اُحد کا نقشہ لائیے کہ محبوبِ خدا' سرورِ عالم' محمدٌ رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں مشرکین کے سامنے سینہ سپر ہیں' آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس معرکۂ کارزار میں جان کی بازی لگا رہے ہیں' اس کشمکش میں رحمۃٌ للعالمین زخمی ہو گئے ہیں' خود کی کڑیاں سرِ مبارک میں گھس گئی ہیں' رخسارِ مبارک بھی مجروح ہو گیا ہے' دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں' آپؐ کا مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے...... اور فرض کیجیے کہ عین اُس وقت کوئی مدعیٔ عشقِ رسول ﷺ کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو' آنحضور ﷺ پر سلام پڑھ رہا ہو یا آپ ﷺ کی شان میں نعتیں پڑھے جا رہا ہو' تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی! اس طرزِ عمل کا ایمان بالرسولؐ اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت وتعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ تو کارزارِ اُحد میں' جہاں پر ہر چہار طرف موت کا رقص

ہو رہا ہو' اپنے جاں نثاروں کے ساتھ اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم فرما رہے ہوں اور اللہ کے جھنڈے کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسولؐ کہیں کسی گوشے میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو' جس قدر مضحکہ خیز اُس وقت ہوتا اسی قدر مضحکہ خیز آج بھی ہے۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ کا مشن مُردہ نہیں ہوا' زندہ و تابندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے اور آپ ﷺ کے بعد یہ فریضۂ رسالت اُمتِ مسلمہ کو بحیثیت اُمت ادا کرنا ہے۔ بنی نوع انسان آج بھی ہدایتِ ربانی کی محتاج ہے۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے۔ آج بھی ہر اُس شخص پر جو خود کو مسلمان سمجھتا ہے' یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ آنحضور ﷺ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لیے نہ تھی' بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے تھی۔ آنحضور ﷺ کی بعثت ایک مخصوص زمانے اور وقت کے لیے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لیے تھی۔ توحید کی دعوت دینا' شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس آیت کی کامل شان کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اس کا ظہور اُس وقت تک نہ ہوگا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اُسی طرح اللہ کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطلہ کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے جس طرح محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تیئیس سال کی محنت شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور وہاں پہلے سے قائم طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے' نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پس اب اس مدعیٔ ایمان' اس عاشقِ رسولؐ اور اس محبِّ رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہیے جسے حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپؐ کے مشن سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسے خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورت حال رونما ہو چکی ہے کہ بقولِ حالی: ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

نبی اکرم ﷺ کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں

یہی وہ صورت حال ہے جس کی آنحضور ﷺ نے خبر دی تھی۔ صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) (۱)

''اسلام کی ابتدا غربت (اجنبیت) کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ جائے گا۔ تو بشارت ہے ''غرباء'' کے لیے۔''

اردو میں غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہوتے ہیں' لیکن عربی میں یہ لفظ ''اجنبی'' کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ جیسے ایک اجنبی مسافر اپنے اہل و عیال اور اپنے وطن سے دور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے' اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں اجنبی اور تنہا تھا' یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ پھر غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔ کفار' ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی' اگرچہ نام کے مسلمان کثیر التعداد ہوں گے لیکن سچے' موحّد' دین دار اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو اِن قلیل 'غرباء'' کے لیے (بہشت کی)

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام بدأ غریباً و سیعود غریباً......

بشارت اور مبارک باد ہے۔ مسند احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضورﷺ نے ''غرباء'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

((اُنَاسٌ صَالِحُوْنَ فِیْ اُنَاسِ سُوْءٍ کَثِیرٍ مَنْ یَعْصِیْھِمْ اَکْثَرُ مِمَّنْ یُطِیْعُھُمْ))

''برے لوگوں کی کثیر تعداد میں وہ نیک لوگ (غرباء) ہیں کہ جن کی بات ماننے والے کم ہوں اور نافرمانی کرنے والے زیادہ ہوں''۔

ایک اور روایت میں حضورﷺ نے خبر دی کہ:

((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلاَّ اسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلاَّ رَسْمُہٗ))(۱)

''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ نہ بچے گا۔''

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر اسلام کہیں فی الواقع قائم نظر نہیں آئے گا۔ انسانوں کے کردار اور ان کی شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما دیکھنے کے لیے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ اس کی تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے باقی رہ جائے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر اِن احادیثِ مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اسے حضورﷺ سے محبت ہے' اگر اسے حضورﷺ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے' اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضورﷺ کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اس کا مقصودِ حیات اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمدٌ رسول اللہﷺ کا مقصدِ بعثت تھا؟ یعنی اعلاءِ کلمۃ اللہ' اظھارُ دینِ الحقِّ علی الدّین کُلِّه اور تکبیر ربّ! اگر ہم میں سے کسی کے مقاصدِ زندگی میں اللہ کے دین کو دنیا میں غالب

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح' کتاب العلم' الفصل الثالث۔

کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم شامل نہیں' اور اگر وہ آنحضورﷺ کے مشن کی تکمیل میں آپﷺ کا دست و بازو اور آپؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا آنحضورﷺ سے تعلق درست نہیں' جس کی اسے فکر کرنی چاہیے۔ تو یہ ہے نبی اکرمﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو ''وَنَصَرُوْہُ'' کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

اتباع کا تقاضا

''نصرتِ رسولﷺ'' کی مزید وضاحت ''اتباعِ رسولﷺ'' کے حوالے سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' اتباع کے معنی ہیں آنحضورﷺ کے نقش قدم پر چلنا اور آپﷺ کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے' پیہم و مسلسل ہوا ہے' جو پورے تیئیس برس تک شب و روز ہوا ہے' جس میں ایک لمحے اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں' وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں' کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا؟ ان سب کے لیے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے' جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں' اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرمﷺ نے اوّل یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دُنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم' مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے' جلوت و خلوت میں کیا ہے' وہ عمل دعوت و تبلیغ کا عمل ہے' وہ تکبیرِ ربّ کی سعی و جہد ہے' وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہے' وہ دینِ حق کے سربلند کرنے کی تگ و دَو ہے' وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ اور تصادم ہے۔ اس سعی و جہد اور مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں' صورتوں میں تبدیلی آئی ہے' بتدریج مختلف مراحل آئے

ہیں۔ کہیں مکی دَور میں یہ جدوجہد دعوت وتبلیغ اور شدائد ومصائب کے برداشت کرنے کے درجے میں تھی‘ جس میں آپؐ کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دَور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر واُحد اور احزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی‘ کہیں قبائل عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود وخطوط کے ذریعے دعوت دینے کے مراحل میں تھی اور کہیں صلح حدیبیہ‘ فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری وساری تھی۔ لیکن آپؐ کا جو عمل تیئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے‘ ہر لمحہ‘ ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے‘ وہ ہے عملِ دعوت وتبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبعِ رسول ﷺ ہونے کا مدعی ہو‘ جو یہ سمجھتا ہو کہ سنتِ رسول ﷺ کا التزام ضروری ہے‘ اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی‘ سب سے زیادہ متواتر‘ متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت وتبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسولؐ کی نصرت اللہ کی نصرت ہے

نصرتِ رسولؐ کے حوالے سے قرآنِ مجید کا ایک اہم مقام سورۃ الصّف کی آخری آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؑ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا: ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ یعنی ”اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟“ تکبیر ربّ‘ دعوتِ توحید‘ تبلیغ دین اور نورِ ہدایت سے دنیا کو منور کرنے کا جو کام میرے سپرد ہوا ہے اس کی جدوجہد میں اب کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو اس راہ میں میرا دست و بازو بنے؟ آنحضرتؑ کے حواریوں کے جواب کو قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے: ﴿قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ﴾ یعنی ”حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار“۔ حضرت مسیحؑ کے سوال اور حواریوں کے جواب کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا: ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی

اللّٰہِ﴾ جواب دیا گیا: ﴿نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ﴾ جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ رسولؐ کی نصرت اللہ ہی کی نصرت ہے اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسولؐ کا حامی‘ مددگار اور دست و بازو بنتا ہے‘ اس راہ میں جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا جان و مال کھپاتا ہے‘ وہ اللہ کے رسولؐ کی نصرت بھی کر رہا ہے اور اللہ کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ چنانچہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسولؐ دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔

۴ اتباعِ قرآن مجید

اب اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد کا ذکر ہے اور وہ ہے نورِ قرآن مجید کو حرزِ جان بنانا‘ اسے اپنا راہنما قرار دینا اور اس کا اتباع کرنا۔ فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ﴾ ”اور اتباع کیا اُس نور کا جو اُن (ﷺ) کے ساتھ (یا ان پر) نازل کیا گیا۔“ یہاں نور سے مراد قرآن ہے‘ یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا‘ اس کا اتباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں‘ یعنی ”اٰمَنُوۡا بِہٖ وَعَزَّرُوۡہُ وَنَصَرُوۡہُ“‘ تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس چوتھی بات کا اضافہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ ”وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ!“ یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی اکرم ﷺ بہرحال اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک معین مدت تک کے لیے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آنحضور ﷺ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی۔ آنحضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابد الآباد تک کے لیے جس چیز کو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے‘ جو فرقانِ حمید بھی ہے اور کتابِ مبین بھی۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا‘ گویا آپ ﷺ کے

ساتھ اُترا۔ اور یہ وہ نور ہے جو دائم وقائم ہے۔ بقول اقبالؒ:

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں   زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے بارے میں تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ کِتَابُ اللّٰہِ)) (۱)

''اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ''۔

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں گفتگو سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم اس ارشاد گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آپؐ کشمکشِ حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پورے خطبے میں موجود ہے' بلکہ خطبے کے آغاز ہی میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ یَوْمِیْ ھٰذَا بِمَکَانِیْ ھٰذَا' فَرَحِمَ اللّٰہُ مَنْ سَمِعَ مَقَالَتِی الْیَوْمَ فَوَعَاھَا......)) (۲)

''لوگو! اللہ کی قسم' میں نہیں جانتا' شاید آج کے بعد میں تم سے اس مقام پر دوبارہ نہ مل سکوں۔ پس اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے آج میری باتوں کو سنا اور ان کو یاد رکھا......''

چنانچہ اس خطبہ میں آنحضور ﷺ کے ارشادات کا انداز وصیت کا سا ہے' یعنی اُمت کو ان اُمور کی تاکید و تلقین جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے یہ بات تاکیداً ارشاد فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا' اسے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

(۲) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب الاقتداء بالعلماء۔

حرزِ جان بنانا' اس کے دامن سے وابستہ رہنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جا رہا ہوں جو تمہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حبل اللہ

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمودات کی رُو سے قرآن مجید ہی وہ ''حبل اللہ'' ہے جس کے ساتھ چمٹ جانے اور وابستہ ہو جانے کا سورۂ آلِ عمران میں حکم آیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حکم سورۃ الحج میں وارد ہوا ہے جس کی آخری آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ﴾ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ''۔ اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ سے کیسے چمٹیں' اس کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ﴾ ''اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو''۔ اللہ کی رسّی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس وضاحت کے باوجود یہ سوال باقی رہا کہ پھر حبل اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیسے تھامیں؟ کس سے جُڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبی اکرم ﷺ نے فرما دی اور وحی غیر متلو کے ذریعے اُمت کو مطلع فرما دیا کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسّی ہے جس سے اعتصام کا' جس کے ساتھ چمٹ جانے اور جڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم سورۂ آل عمران میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نہایت جامع حدیث میں جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت' اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی اہمیت کا بیان مفصل انداز میں ہوا ہے' نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) یعنی ''یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔'' اسی طویل حدیث میں قرآنِ حکیم کی شان میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی لائق توجہ ہیں کہ

''قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے' نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے''۔ یعنی اس کے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا' اور اس کان سے حکمت و معارف کے نئے نئے موتی اور جواہرات برآمد ہوتے رہیں گے۔ (یہ حدیث سنن ترمذی اور سنن دارمی میں روایت ہوئی ہے۔)

ہماری حالتِ زار

نبی اکرم ﷺ نے تو خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تا ابد گمراہ نہیں ہوگے' لیکن بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہوجانے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت قرار پایا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی کی صورت ہی میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں' آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا' اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی و راہنما سمجھا' اپنے عمل' اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی' ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا' دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا' لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور نتیجتاً مغلوب و مقہور ہوگئے۔ ان کے عقائد خراب ہوئے' اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو دراندازی کا موقع ملا۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ بنیانِ مرصوص بنتے' بے شمار فرقوں اور قومی و نسلی اور لسانی و جغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہوکر رہ گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہیے آج اسے ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں

رہا کہ ہم اسے محض حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اگر اس کی تلاوت کرتے بھی ہیں تو اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے نہیں' بلکہ محض حصولِ ثواب کے لیے! بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا' اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لیے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ گویا اپنے لیے بھی اب ہم تلاوتِ قرآن کے ذریعے حصولِ ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے' بلکہ اب تو قرآنِ مجید ہمارے نزدیک صرف مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے!! بقول اقبال:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:
﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾ ''اور کہا رسولؐ نے کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا (نظرانداز کر دیا تھا)''۔ اگرچہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اس آیت میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز تھی ہی نہیں اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیِ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے' تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ و التفات کی روش اختیار کریں' یعنی جو نہ اس کی تلاوت کو اپنے معمولات میں شامل کرتے ہوں' نہ اسے اپنے غور و فکر کا موضوع بناتے ہوں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنانے پر آمادہ ہوں۔ یہاں آیت زیرِ نظر ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ میں ''اتباع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ ہر حکم' ہر ہدایت' ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن حکیم کے ساتھ اگر اس نوع کا تعلق ہوگا تو ہم نہ صرف یہ کہ گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے' بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہماری نسبت بھی صحیح

بنیادوں پر استوار رہ سکے گی! ...... یہاں یہ بات اب بالکل واضح ہوگئی کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا' اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی' حَکم اور راہنما قرار دینا' اس کی تعلیمات پر عمل کرنا' اس کی صبح وشام تلاوت کرنا' اس میں تدبر اور غور وفکر کرنا' اس کو حرزِ جان بنانا' اس کا اتباع کرنا' یہ ہے نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ گویا اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمد ﷺ سے جڑ گئے اور اس سے کٹے تو محمد ﷺ سے کٹ گئے۔

اصلاحِ حال کا واحد طریق

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے' اس ضمن میں یہ حدیث شریف نہایت جامع ہے' جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَفْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (۱)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنا لو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگِ عالم میں) پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس میں تدبر اور غور وفکر کیا کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضور ﷺ نے اہلِ قرآن کا خطاب دیا ہے: ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ''۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اُس خطاب کے جو قرآن یہود ونصاریٰ کو دیتا ہے ''یَا اَھْلَ الْکِتَابِ''۔ الکتاب کا آخری' مکمل اور جامع ایڈیشن ''القرآن'' ہے جس کی حامل اُمتِ مسلمہ ہے' اسی مناسبت سے آنحضور ﷺ نے اُمت کو ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ سبحان اللہ' کتنا پیارا خطاب ہے جو اِس اُمت کو

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان

ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی موقع پر یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے ''اہلِ قرآن'' کا عنوان اختیار کیا' ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا' حالانکہ یہ نام انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے گمراہ کن نظریات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا اصل نام ہونا چاہیے تھا ''منکرینِ سنت'' یا ''منکرینِ حدیث''۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جس کے وہ ہرگز اہل نہیں ہیں! یہ خطاب تو آنحضور ﷺ نے اُپنی امت کو دیا تھا' منکرینِ حدیث کو نہیں!

اس حدیث کا ایک ایک لفظ لائقِ توجہ ہے۔ کس قدر جامع ہیں نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔ یہاں اس حدیث کی تشریح تو پیش نظر نہیں ہے' محض ایک نکتے کی جانب اشارہ کر کے ہم آگے بڑھیں گے۔ ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ'' کا سادہ سا ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا۔ لیکن یہاں تکیہ کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ تکیہ چونکہ کمر کے پیچھے لگایا جاتا ہے' لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈال دینا' اسے نظر انداز نہ کر دینا۔ پھر یہ کہ تکیہ چونکہ سہارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول کر اور اسے نہایت قیمتی جزدان میں اونچے طاق پر رکھ کر مطمئن ہو جاؤ کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ اس کتابِ مبین سے ہمارا عملی تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے' چاہے وہ جھوٹی قسم ہی کیوں نہ ہو' تو اس کے لیے اس کتاب کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے' دم توڑتے شخص کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنا دی جاتی ہے' یا بیٹی کو قرآن کا ایک نسخہ جہیز میں دے کر ایک رسم پوری کر دی جاتی ہے' اللہ اللہ اور خیر سلا! قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا عملی

رویہ تو وہ ہونا چاہیے جو اس حدیث کی رو سے سامنے آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ میں ہمارے لیے فکری و عملی راہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

اللہ کے اس نور کا جو محمد ﷺ کے توسط سے ہم کو ملا' جب ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس دنیا میں اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم یہاں ذلت و رسوائی کا ایک عبرت ناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذابِ اُخروی' تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے اور وہ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے تو دوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسا صادق آتا ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کا یہ فرمان جسے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ: ((اِنَّ اللّٰـہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَـرِیْـنَ))[1] یعنی ''اللہ تعالیٰ یقیناً اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار کرے گا۔'' گویا دنیا میں بحیثیتِ قوم ہماری تقدیر اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حدیث کی بہت عمدہ تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آیت زیرِ نظر کے اس ٹکڑے ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ﴾ پر غور کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں ایمان بالرسالت' توقیر و تعظیمِ رسولؐ اور نصرتِ رسولؐ یعنی نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پوری طرح احاطہ کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ......

ہے کہ فلاح و صلاح اور نجات نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستگی پر موقوف ہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل ایک بات مزید عرض کرنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کا زوال و انحطاط دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام اپنی تقریروں اور تحریروں میں کہتے چلے آئے ہیں' جن میں سے ایک ایسی بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں۔ وہ ماضی بعید کی نہیں' ماضی قریب کی ایک مسلّمہ محترم شخصیت ہیں اور وہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تالیف ''وحدتِ اُمت'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور علماء کو جمع کیا اور فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے انہیں آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں

پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزومند ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرکوز ہو جانی چاہیے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے‘ سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی بہترین عملی جدوجہد اور قوتوں کو صرف کرنا اگر ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرے میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہوگا‘ عقائد اسی سے درست ہوں گے‘ جاہلیتِ قدیمہ وجدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہوگا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دور ہوں گے‘ عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہوگی۔ معاملات اگر سنوریں گے تو اسی کتاب مبین کی رشد و ہدایت سے سنوریں گے۔ اور اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبلُ اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم ہوگا۔ اس کی بنیاد پر جو دعوت اٹھے گی اور نبی اکرم ﷺ کے طریق پر جو انقلابی کام ہوگا اسی کے نتیجے میں یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے!

تعلّم و تعلیم قرآن کی عظمت و اہمیت اور قرآن حکیم کے ’’حبل اللہ‘‘ ہونے کے بارے میں درج ذیل تین احادیث نہایت اہم اور جامع ہیں۔ انہیں اپنے ذہن نشین کر لیجیے۔ پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان ؓ۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) یعنی ’’تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔‘‘

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم ؓ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَلَیْسَ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟)) قُلْنَا: بَلٰی‘ قَالَ: ((فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ‘ فَتَمَسَّکُوْا بِہٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا))

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟‘‘ ہم نے عرض کیا: یقیناً! تب آپؐ نے فرمایا: ’’پس تم خوشیاں مناؤ‘ اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ۔‘‘

تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدری ؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((کِتَابُ اللّٰہِ‘ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ))(۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔‘‘

حرفِ آخر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادوں میں سے اولین بنیاد ’’ایمان‘‘ ہے اور دوسری توقیر و تعظیم‘ جو دراصل ایمان ہی کا فوری لازمی تقاضا ہے۔ ایمان و تعظیم ہی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پورے طور پر اطاعت کی جائے اور یہ کہ ہمارے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت خود سے اور دوسرے تمام انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ ان دونوں چیزوں کے اجتماع کا نام ’’اتباعِ رسولؐ‘‘ ہے جو فی الاصل مطلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد ’’نصرت‘‘

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ وابن جریر بحوالہ صحیح الجامع الصغیر للالبانی: ۴۴۷۳۔

ہے۔اس نصرت کی ضرورت نبیؐ کو اپنے کسی ذاتی کام کے لیے نہیں' بلکہ اپنے مشن کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد میں انہیں معاون اور دست و بازو درکار ہیں۔ آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ایک درجے میں ہوئی' یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک۔ حالانکہ آپﷺ کی بعثت کُل روئے ارضی کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ وسیع تر سطح پر دعوت وتبلیغ کا کام اور پورے کرۂ ارضی پر غلبۂ دین کا مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض اُمت کے ذمہ ہے' اس مشن کی تکمیل کا بوجھ اُمت کے کندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرمﷺ کی طرف سے ہر اُس شخص کی طرف منتقل ہوئی ہے جو رسول اللہﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور آپﷺ کا نام لیوا ہے۔ آنحضورﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد ''اتباعِ قرآن مجید'' ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لیے اس طریق کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے جس پر کاربند ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر' اس کے داعی' علمبردار اور پیغامبر بن کر ہمیں دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ رسول اللہﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دُنیوی و اُخروی فوز وفلاح مضمر ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ OO

☆ —— ☆ —— ☆

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**